R No 2186/A7

Regd. No A. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 30

Telegrams "ANJUMAN"

جلد ۲۰ - شمارہ ۱۷ | ایڈیٹر آل احمد سرور | علی گڑھ - یکم مئی سنہ ۱۹۶۱ء

[illegible]

شوق نیموی

شعر گوئی اور زبان دانی کے علاوہ خصوصاً فن حدیث میں شوق نیموی کا بہت بلند پایہ ہے۔ آثار السنن میں بعض وہ امور اور تحقیقات نادرہ ہیں جو اگلے محدثین متقدمین کی کتابوں میں بھی نہیں پائے جاتے، ارشاد خداوندی ہے وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ۔ علامہ نیموی مقدمہ تبیان التحقیق میں لکھتے ہیں: وَقَدْ تَفَرَّدْتُ فِي مَوَاضِعَ مِنْ آثَارِ السُّنَنِ بِتَحْقِيقَاتٍ عَجِيبَةٍ وَفَوَائِدَ غَرِيبَةٍ خَلَتْ عَنْهَا زُبُرُ الْمُحَدِّثِينَ وَلَمْ يَظْفَرْ بِهَا أَحَدٌ مِنَ الْمُتَقَدِّمِينَ وَالْمُتَأَخِّرِينَ وَسَنَذْكُرُ لَكَ بَعْضًا مِنْهَا حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ وَيَكُونَ تَبْصِرَةً لَكَ وَلِسَائِرِ النَّاظِرِينَ ۔ اس کے بعد علامہ موصوف نے اپنی تحقیقات کا قدرے نمونہ رسالہ مذکور میں دکھایا ہے اور آثار السنن کی تالیف کے قبل آپ یادگار وطن میں لکھتے ہیں: اے صوبۂ بہار کے بسنے والو ذرا کان لگا کر سنو کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہمیں علوم عربیہ عطا کئے ہیں وہی ہمارے لئے مایۂ فخر ہیں اور انھیں کو ہم دین و دنیا کا سرمایۂ عزت جانتے ہیں مگر پھر بھی جو ابھی تک اُن کے علوم عربیہ کے بیان کے وسیع میدان میں اپنے شہب علم کو جولاں نہیں کیا ہے اور صرف اُردو زبان دانی کی ترقی کے اظہار میں اس قدر خامہ فرسائی کی ہے اور اپنی زبان حق بیان پر شعلی کے داغ خود ستائی کے دیئے قبول کئے ہیں اُس کی وجہ یہ ہے کہ صوبۂ بہار کے بے مثل تاریخ داں ہمارے لائق ہم وطن جناب شاد عظیم آبادی نے نوائے وطن مسکرہ میں نہایت حسرت کے ساتھ یہ ابھارنے والی تحریر عبرت انگیز فقرہ جوش پیدا کرنے والی عبارت لکھی ہے کہ "افسوس ہے صوبۂ بہار کے عالی خیال مصنف اس زبان دانی کی گھڑ دوڑ میں اپنے ملک والوں کے مقابلے میں بالکل پیچھے ہو رہے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اب تک اس ملک سے خاص اُردو زبان میں کوئی ایسی تصنیف نہیں نکلی کہ ملک ملک اور دور دور کے مصنفوں کی اُس پر آنکھیں اٹھ جائیں"

حضرات ناظرین نوائے وطن کی یہ حسرت آمیز و عبرت انگیز تحریر ملاحظہ کر چکے، اب شان خدائی سُنئے۔ ع: اُسے غش کرتے نہیں لگتی بار

اُس کتاب کی اشاعت کے کچھ قبل ہی مجھ ایسے ننگ صوبۂ بہار کے دل میں زبان دانی کا شوق ڈال دیا اور بات کی بات میں ایسا شہسوار میدان تحقیق بنا دیا کہ دم بھر میں میں نے عرصہ گاہ تالیف میں جھنڈا گاڑ دیا اور حرف غلط کی طرح صوبۂ بہار کی مقدس پیشانی سے کلنک کا ٹیکا مٹا دیا۔ اگر حضرات ناظرین مجھ کو حقیقت نگاری کی اجازت دیتے ہیں تو مجھے اس امر کے اظہار میں ذرا تامل نہیں کہ خدا کے فضل سے ہندستان میں شاید کوئی ایسا شہر ہوگا جہاں میری تالیف و تصنیف نے جلوہ نہ دکھایا ہو اور اپنا رنگ نہ جمایا ہو۔" اور علامہ نیموی اپنے عربی رسالہ عمدۃ العناقید میں تحریر فرماتے ہیں جس کا حاصل ترجمہ یہ ہے ہم نے آثار السنن کے چند جزو ماہ شعبان ۱۳۱۰ھ میں مکہ مکرمہ علامہ محدث اجل صوفی اکمل جناب مولانا شاہ محمد عبدالحق کی مہاجر کی خدمت میں بھیجے، مولانا ممدوح نے مکہ معظمہ سے یہ خط لکھا، آپ کی کتاب آثار السنن عین عید کے دن کہ اس وقت علماء کی ایک جماعت موجود تھی بسبیل ڈاک موصول ہوئی۔ ان لوگوں نے مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ آپ کی تحقیقات نادرہ معلوم کر کے بے حد مسرور ہوئے اور آپ کو دعائیں دیں۔ پھر اس خط کے بعد مولانا مہاجر مکی نے ایک ماہ کے بعد دوسرے خط میں یہ لکھا۔ یہاں کے شیخ العلماء نے مسجد حرام میں ہاتھ اٹھا کر آپ کے لئے دعائیں مانگیں۔ اور مولانا نیموی آثار السنن جلد اول [illegible] میں لکھتے ہیں: وَالْحَدِيثُ مَعْلُولٌ بِجُمْلَةٍ مِنْ وُجُوهٍ وَقَدْ بَيَّنْتُهَا كُلَّهَا بِأَدِلَّةٍ قَوِيَّةٍ لَمْ يُسْبَقْ إِلَى بَعْضِهَا أَحَدٌ مِنَ الْمُتَقَدِّمِينَ فَضْلًا عَنِ الْمُتَأَخِّرِينَ ۔ اور صفحہ ۱۱ جلد اول میں

فرماتے ہیں فَاحْفَظْہُ فَاِنَّ ھٰذَا الجَوَابَ لَا تَجِدُہٗ فِی غَیْرِ ھٰذَا الکِتَاب، یعنی یہ جواب سوائے اس کتاب آثار السنن کے کسی متقدمین محدثین کی کتابوں میں نہیں پاؤ گے۔ اور رسالہ فارسی ازاحۃ الاغلاط مولفہ مولانا شوق ایک عمدہ رسالہ فن لغت میں ہے اس کو فاضل جلیل جناب سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے ایڈیٹر اردوئے معلی علی گڑھ مرحوم نے اردو پریس علی گڑھ میں اپنے ذاتی روپے خرچ کر کے ۱۹۰۸ء میں چھاپا اور خود انھوں نے علی گڑھ سے شایع کیا اور اس کا اشتہار بھی اپنے رسالہ موسومہ انتخاب دیوان حسرت طبع اول مطبوعہ ۱۹۱۹ء کے ٹائٹل پیج پر شایع کیا۔ اور جب یہ رسالہ ازاحۃ الاغلاط بزمن حیات علامہ شوق مرحوم خلد آشیان نواب کلب علی خاں بہادر والی رام پور مرحوم کی نظر سے گزرا تو وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کمال قدردانی سے ملاقات کے لئے مولانا شوق کو کہ آپ اس وقت لکھنؤ میں مقیم تھے دربار رام پور بلا بھیجا۔ اور چلتے وقت معتدبہ روپے عطا کئے۔ مولانا شوق کی نسبت فاضل اجل آغا عبداللہ متخلص بہ خاکی متوطن دار المرز رشت ملک ایران یوں رطب اللسان ہیں سہ

بود بزدات او فخرم و جو وشش دا ہمی نازم
کہ در تصحیح و تحقیق لغت دارد ید طولےٰ
سخن گوی و سخن دان و سخن سنج و سخن پرور
ظہیر احسن کہ گو بندش در اقلیم سخن شوقا

اور مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی مرحوم و مغفور ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں سہ

رقصد قلم از شوق چو نام تو نویسند
در پوست نہ گنجد چو سلام تو نویسند

اور مولانا محمد عبد العلی آسی مدراسی مرحوم جو اکثر کتب درسیہ کے محشی ہیں وہ مادہ تاریخ وصال میں فرماتے ہیں۔

سلام سخن نامی ود ران زمن بود ۔ کیونکہ مولانا شوق نیموی کا وصال بتاریخ ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ مطابق ۲۵ نومبر ۱۹۰۴ء بروز جمعہ ایک بج کر دس منٹ پر بعمر ۴۴ سال قمری ہے کیونکہ آپ کی ولادت ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۸ھ میں ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک رباعی میں فرماتے ہیں سہ

شوق است تخلصم ظہیر احسن نام ■ در قریۂ دلنواز نیمی ست مقام
شد از پے گفتیم ابو الخیر الہام ■ تاریخ تولدم ظہیر الاسلام ۱۲۷۸ھ

اور آپ کی تاریخ وفات میں جیسا کہ دیوان شوق میں مندرج ہے مولوی عبد العزیز اشرف پوری عظیم آبادی مرحوم نے یہ شعر لکھا ہے:۔

ایک بج کر دس منٹ پر روح اقدس آپ کی
دار فانی سے ہوئی رخصت سوئے دار السلام

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ سے خط و کتابت رہا کرتی۔ افسوس ان کے خطوط اور نیز دیگر علماء وغیرہ کے مراسلات ہنگامہ خونین فسادِ بہار جو کہ موضع نیمی میں ۴ نومبر ۱۹۴۶ء کو واقع ہوا ضائع ہو گئے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن سے رسم و مراسم رہا کئے۔ مولوی محمد محسن مرحوم مغفور ساکن موضع نیمی سالار پور کا بیان ہے کہ ہم عربی پڑھنے کے لئے دار العلوم دیو بند گئے تھے۔ شیخ الہند نے پوچھا کہاں مکان ہے، عرض کیا نیمی سالار پور پٹنہ ضلع فرمایا جہاں مولانا شوق نیموی کا مکان ہے میں نے کہا جی ہاں فرمایا کہ مولانا شوق نے جامع الآثار میں نماز جمعہ فی القریٰ کی بحث لاجواب لکھی ہے، پھر شیخ الہند نے میری رہائش کے لئے حجرہ اور تیل وغیرہ کا سامان کر دیا۔

علامہ نیموی کی فن حدیث میں تحقیق و تنقید اور اظہار علل غوامض جیسے کتب اصول میں اغمض انواع علوم حدیث قرار دیا گیا ہے، آثار السنن میں ملاحظہ کرنے کے قابل ہے۔ محدث اجل علامہ انور شاہ کشمیری ثم دہلوی مدرس مدرسہ امینیہ دہلی علامہ نیموی کے حق میں یوں لکھتے ہیں:۔ سہ

ظہیر الحق مولانا الظہیر ● اضاء الارض فی نور اہتداء

یعنی دین حق کے مددگار مولانا ظہیر احسن ہیں جنھوں نے ہدایت کے نور سے ساری دنیا روشن کر دی۔ تقریباً چالیس سال سے آثار السنن صوبہ بہار اور نیز بیرون صوبہ بہار کے بعض مدارس میں داخل نصاب تعلیم کر دی گئی ہے، اور علامہ نیموی کی تحقیقات عجیبہ اور فوائد غریبہ اور اعلال روایت وغیرہ کتب ذیل میں علمائے نامدار و فضلائے باوقار نقل فرماتے ہیں۔

(۱) بذل المجہود شرح سنن ابو داؤد مولفہ مولانا خلیل احمد سہارنپوری۔ (۲) فتح الملہم شرح صحیح مسلم مولانا شبیر احمد عثمانی۔ (۳) اعلاء السنن مولانا اشرف علی تھانوی۔ (۴) فیض الباری شرح صحیح بخاری۔ (۵) بغیۃ الالمعی فی تخریج الزیلعی ادارہ مجلس علمی ڈابھیل، ان کے علاوہ اور کتب میں بھی تحقیقات علامہ نیموی منقول ہیں۔ رسالہ ندیم گیا بہار نمبر بابت ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۱۳ میں پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم۔ اے بحوالہ خمخانۂ سخن معروف بہ دیوان ذہیر مطبوعہ ۱۳۱۶ھ لکھتے ہیں شاہزادہ مرزا احمد رئیس بخت بہادر معروف بہ شاہزادہ محمد ظہیر الدین حیاؔ متخلص بہ ذہیر دہلوی، شاعری میں حضرت مولانا ظہیر احسن شوق نیموی کے شاگرد تھے نہ صرف ذہیر بلکہ ان کے خویش مرزا ارشد بخت بھی حضرت شوق کے شاگردوں میں تھے اور صوبہ بہار کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے ایک فرد نے اردوئے معلیٰ کے مرکز، لال قلعے کے شاہی خاندان کے اشعار کی اصلاح کی ہے ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

خاص اردوئے معلی ہے زباں میری ذہیر
کشور نظم میں کیونکر نہ ہو شہرت میری

ایسی حالت میں حضرت ذہیر کا مولانا شوق کی شاگردی پر ناز کرنا بہار کی عزت کو کتنا بلند کر دیتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔ حضرت شوق کا ہے فیض ذہیر
تجھ میں ایسی جو خوش بیانی ہے۔ (باقی صفحہ پر)

ہماری زبان

یکم مئی سنہ ۱۹۶۱ء

ہماری تنقیدوں کا لب و لہجہ

کہا جاتا ہے کہ انگریزوں نے (Under Statement) کو آرٹ کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ ہمارے یہاں مبالغہ ہی آرٹ سمجھا جاتا ہے۔ خیر یہ مبالغہ تو تھا ہی۔ ادھر ادبی تنقید بھی خاصی بے ادبی راہ پا رہی ہے۔ اگر کسی کے سیاسی مسلک سے اختلاف ہو تو پھر اس کی مٹی پلید کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جاتی۔ اگر کسی کے اسلوب یا اسکول سے اتفاق نہیں ہے تو پھر وہ بالکل گیا گزرا ٹھیرا دیا جاتا ہے۔ بعض لوگ تنقید نہیں کرتے سرٹیفکٹ تقسیم کرتے ہیں۔ بعض کھلاڑیوں یا فلم اسٹاروں کی طرح درجے متعین کرتے ہیں۔ یہ قدر اوّل کی چیز ہے، وہ دوم درجے کی، یہ بہترین لکھنے والا ہے وہ اس کے بعد ہے۔ یہ نئی نسل کا نمائندہ ہے، وہ پُرانا چاول۔ پھر کسی کو کسی پر اعتماد نہیں۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ دوسرے کی تعریف میں میری تنقیص مضمر ہے۔ لکھنے والے جو چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں۔ مورخ کو انشا پرداز بنانا، انشا پرداز کو مفکر ٹھیرانا، اپنے پسندیدہ مصنف کو ایشیا کا عظیم فن کار قرار دینا معمولی بات ہے۔ آج کل کے جتنے شاعر ہیں، وہ رشکِ عرفی و فخرِ غالب ہیں۔ جتنے افسانہ نگار ہیں وہ چیخوف، ماپاساں، گورکی سے بڑھ گئے ہیں۔ جتنے نقاد ہیں، وہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ وغیرہ کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ یہ کیا معیار ہے، یہ کیسا لب و لہجہ ہے، یہ تنقید ہے یا دعینگا مشتی۔

ادب ایک سنجیدہ اور وقیع فن ہے۔ اسے بازیچۂ اطفال نہ بنانا چاہئے۔ اس سے سستے ذاتی، کاروباری یا سیاسی اغراض حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے۔ ادب میں جہاں ایک سنجیدہ تہذیبی نقطۂ نظر ہوتا ہے، وہاں ایک اعلیٰ فنی معیار بھی۔ اس کے لئے جہاں حال کی موجوں سے آشنا ہونا ضروری ہے، وہاں دریا کے بہاؤ پر نظر رکھنا اور عالمی معیاروں اور انسانی تہذیب کے ارتقا پر بھی دھیان دینا ضروری ہے۔ ادب سودا کی نظم (ہجو) یا وِلایتی کی نثر (قرول) نہیں ہے اس کو انعام یا انتقام کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ ادب میں اخلاق کی نقطۂ نظر ضروری ہے مگر اخلاق کے یہ معنی نہیں کہ ادب راہِ نجات یا بہشتی زیور ہو جائے، اس کے لئے سیاسی شعور مفید ہے، مگر سیاسی شعور کے یہ معنی کیسے ہوئے کہ وہ سیاسی دستاویز بھی ہو۔ ادب ذوقِ سلیم کی ترویج و اشاعت کرتا ہے مگر ذوقِ سلیم صرف روایت یا صرف تجربے میں نہیں، دونوں کے سمجھنے اور سمجھ کر برتنے میں ہے۔

اُردو تنقید کی اُٹھان اچھی ہوئی تھی۔ اُس نے باہر کی دُنیا پر معیاروں کی تلاش میں نظر ڈالی تھی، پھر اُس نے اپنے سرمایہ کو بھی کھنگالنا شروع کیا تھا، مگر دونوں پہلوؤں میں ابھی بہت کچھ اضافے کی گنجائش باقی تھی کہ یکایک تنقید پٹری سے اُتر گئی اور شترِ بے مہار کی طرح اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔ آزادی نے اور ستم کیا کہ اپنا ہر تنکا نیستان نظر آنے لگا اور دوسروں کے شہتیر خار و خس بن گئے۔ پھر یار لوگوں نے سر اصول کے ساتھ وہ فٹ بال کھیلنی شروع کی کہ رندوں کی محفل دھول دھپّے اور طنز و تعریض کی بزم گاہ بن گئی۔ کارنامے ہوا میں تحلیل ہونے لگے، شخصیتیں دیو پیکر نظر آنے لگیں، مغز کم ہو گیا، لفاظی بڑھ گئی۔

ایسا نہیں ہے کہ ہماری ساری تنقیدی کوششیں اسی ذیل میں آتی ہیں۔ اب بھی سنجیدہ لکھنے والے موجود ہیں جو اس طوفان۔ بے تمیزی کو دیکھ کر کم لکھ رہے ہیں ان پر یہ الزام ہے کہ یہ لوگ خاموش کیوں ہیں۔ بولتے کیوں نہیں۔ دوسروں کی طرح منہ میں کف کیوں نہیں بھر لاتے۔ ہیٹھیا کے شکار کیوں نہیں، نئی نسل کی عظمت کا اعتراف کیوں نہیں کرتے۔ ان سنجیدہ لکھنے والوں سے اور ان نئے لکھنے والوں سے جن کے یہاں نظر ہے وہ خلوص اور جوش ہے تنقید کا کچھ بھرم قائم ہے ورنہ عام طور پر تنقید کی دنیا، مجذوبوں کی محفل معلوم ہوتی ہے۔

یہ ضرور ہے کہ نقاد کا کام آج پہلے سے زیادہ مشکل ہے۔ اب صرف چند جلیع استادوں یا مغرب کے حوالوں سے کام نہیں چلتا۔ کسی وقتی تحریک کے پیچھے پیچھے چلنا بھی کافی نہیں، ادب کے اپنے مخصوص رول، اس کے اپنے فرائض کا احساس ضروری ہے اور اس فرض کی خاطر اپنے کام میں ایک شانِ فراغت ایک بلندی کا شعور پیدا کرنا ضروری ہے۔ یہ شانِ فراغت صرف سخن فہموں کی فضیلت ہے۔ "طرفداروں" کو یہ بات نصیب نہیں ہو سکتی۔

ادھر اُدھر سے

کارل مارکس کے غائبانہ اُستاد

مرکزی وزیر ہند برائے ثقافتی امور سائنٹفک تحقیقات جناب ہمایوں کبیر نے پٹنہ کالج میں رسل کے ساتویں یادگار لکچر کے موقع پر مرزا ابوطالب خاں کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہا، موصوف ایک نامور مورخ گزرے ہیں جن کو بجا طور پر روس کے مشہور سیاسی رہنما کارل مارکس کا غائبانہ اُستاد کہا جاسکتا ہے مرزا ابوطالب خاں کارل مارکس سے ۵۰ سال پہلے گزرے ہیں۔ مرزا ابوطالب کو موجودہ "ہسٹر ہو گرافی" کا موجد کہنا بے جا نہ ہوگا۔ وہ سب سے پہلے تاریخ داں تھے جنھوں نے تاریخ عالم پر اقتصادیات کے اثر کو محسوس کیا اور کارل مارکس سے ۵۰ سال پہلے اقتصادیات کے وہ مسائل بیان کئے جنھیں کارل مارکس نے اپنایا اور غائبانہ طور پر مرزا موصوف کو اپنا استاد تسلیم کیا۔ مرزا ابوطالب خاں نے ایشیا، افریقہ اور یورپ کا دورہ کیا اور دنیا کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی لیکن افسوس ہے وہ مکمل نہ کرسکے۔

انھوں نے تاریخ اودھ میں بڑی خوبی اور نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے کہ وہاں کے امیرانہ زندگی کے ٹھاٹ غریبوں کے ساتھ بے التفاتی پر قائم تھے۔ جناب ہمایوں کبیر نے افسوس ظاہر فرمایا کہ ہندوستان کے ایک مشہور نامور مورخ کو ہمارے تاریخ دانوں نے بھلا دیا۔

پہنچا کہاں سے کہاں .....

اُردو :	دو (۲) ؛	دینا
سنسکرت	دوی	دا
لاطینی	ڈُو	دو
فارسی	دو	دادن
اطالوی	دوئے	دارے
ہسپانوی	دوس	دار
روسی	دُوا	دوات
فرانسیسی	دے	دُونے

اُردو : پیالہ روسی : پ آلَ

(اقبال کرشن)

اُردو سیکھنے کے لئے امریکی طلبہ کو وظائف

غیر ملکی زبانوں سے امریکی طلبہ کی دلچسپی کو حکومت کی جانب سے بڑی تقویت پہنچی ہے۔ ایسی زبانوں کی تعلیم کے لئے جو امریکہ میں عام طور پر پڑھائی نہیں جاتیں (۷۹۵) وظائف رکھے گئے ہیں ان میں سے (۲۴۵) وظائف عربی، چینی، ہندی، اُردو، جاپان، پرتگالی اور روسی زبان کے لئے ہیں۔

لندن سے پہلا اُردو اخبار

لندن سے اُردو کا پہلا ہفت روزہ اخبار "مشرق" ۱۰ اپریل ۱۹۶۱ء سے شائع ہونا شروع ہوگیا ہے۔ یہ اُردو کا پہلا اخبار ہے جو دنیا کے اس سب سے بڑے اخباری مرکز سے شائع ہو رہا ہے اس کے ایڈیٹر محمود ہاشمی ہیں۔ یہ اخبار لاکسٹن پبلشرز کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے۔ اخبار کے صفحات سولہ اور سائز ۲۰ × ۱۴ ہے۔ پورا اخبار آفسٹ پر چھاپا گیا ہے۔ یہ اس لحاظ سے بھی اُردو کا منفرد اخبار ہے۔

اُردو کتابوں کے روسی ترجمے

حال میں اُردو کتابوں کے جو ترجمے ہوئے ہیں ان میں کرشن چندر کا ناول "کھلا آسمان"۔ سجاد ظہیر کے طویل افسانے "لندن کی ایک رات" اور ان کے بعض مضامین، اور خطوط کا ایک مجموعہ شامل ہے۔ بچوں کے لئے پریم چند کا ایک مجموعہ "سانپ کے من" کے نام سے تاشقند میں شائع ہوا ہے۔ یہ ڈیڑھ لاکھ کاپیوں کا ایڈیشن ہے۔

اُردو۔ ہندوستانی زبانوں کا سنگم

مسٹر کونڈا لکشمن باپوجی وزیر چھوٹی مصنوعات آندھرا نے علاء الدین ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ کے سالانہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اُردو زبان کو ہندوستانی زبانوں کا سنگم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں کئی زبانوں کے الفاظ ملتے ہیں۔ انھوں نے اس موقع پر انگریزی میں سنائی گئی رپورٹ کو آئندہ اُردو میں سُنانے پر زور دیا۔

ظفر اکیڈمی (بنارس)

ظفر اکیڈمی نے بہادر شاہ ظفر کی تصانیف کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے لئے ملک بھر میں ظفر کی تحریروں کی تلاش کی جائے گی۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنی زندگی کے آخری چند سال جلاوطنی کی حالت میں رنگون میں گزارے تھے، اور وہاں بہت کچھ لکھا تھا۔ اکیڈمی کے ذمہ داران ان تصانیف کی تلاش کے سلسلے میں برمی حکومت سے اجازت حاصل کریں گے۔

رباعیات امجد کا تلگو ترجمہ

ایس سدا سیوڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس ملقہ لپیہ (آندھرا) نے حضرت امجد کی پچاس رباعیوں کا تلگو میں ترجمہ کیا ہے۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی کی طرف سے اُن کی اشاعت کے لئے کوشش کی جارہی ہے۔

واہی

انتقال کے بعد

(طنزیہ)

آخر ش دنیا سے واہی کا ہوا جب انتقال
اُس کے گھر والوں پہ کیا گذری نہ پوچھو اس کا حال
یہ خبر جب ظرفاء کے شہر میں پھیلی تمام
اُس کے گھر پر ہو گیا اہلِ ادب کا اژدہام
چند اک احباب کے چندوں سے جب آیا کفن
غسلِ میت دے کے تب ڈھانپا گیا اُس کا بدن
ایک صاحب اشک باری جن کی گوہر بار تھی
لاش ابھی اُٹھی نہ تھی نظم اُن کی اک تیار تھی
قطعۂ تاریخ اک شاعر نے برجستہ کہا
نام سے مرحوم کے نکلا تھا پورا مادہ
ریڈیو نے نشر کی جب یہ خبر بھوپال سے
تعزیت کے تار آئے سندھ سے بنگال سے
انجمن میں تعزیت کا ایک جلسہ بھی ہوا
جا بجا مرحوم کی سیرت کا چرچا بھی ہوا
خاص نمبر بھی نکالے ناشروں نے خوب خوب
تھا یہ رونا ہو گیا سورج ظرافت کا غروب
بعد مردن حق بچارے کا ادا ہونے لگا
اس کے فن پر ناقدوں کا تبصرہ ہونے لگا
ایک ناقد نے یہاں تک بڑھ کے لکھا جوش میں
اُس کا فن اکبر سے بالاتر تھا تن میں توش میں
اک حشم گھر پہ اُسکے رات دن جانے لگے
اُس کے حجرے گھر کی تصویریں اُتروانے لگے
اُس کی تحریروں کا متن و حاشیہ دیکھا کیے
اُس کی نظموں کا ردیف و قافیہ دیکھا کیے
کاوشِ تحقیق سے اُن کی اُبھرا تھا سب کا حال
کرتے پھرتے تھے محلے میں ہر اک سے سوال
کون سا روغن کیا کرتا تھا استعمال وہ
بھات کھاتا تھا کہ دونوں وقت روٹی دال وہ
نوٹ بک میں اُس کی جو کاغذ ہے کتنے دن کا ہے
جس قلم سے رات دن لکھتا تھا وہ کس سن کا ہے
ایک لیڈر نے بنائی اک کمیٹی شان دار
اُس میں طے پایا کہ قائم ہو اک ایسی یادگار
جس سے نام حضرتِ واہی سدا قائم رہے
گلشنِ طنز و ظرافت کی ہوا قائم رہے
اور جاری ہو گیا چندوں کا پھر تو کاروبار
خوب چمکا پیٹ کے بندوں کا پھر تو کاروبار
بمبئی سے اور دلی سے کئی اک پبلشر
اُڑ کے طیاروں پہ آئے اور پہنچے اُسکے گھر
اُس کے مجموعوں کے حقِ ملکیت کے واسطے
اپنا نقصان اور اُس کی منفعت کے واسطے
کچھ حقوق اپنے جتائے کچھ دلیلیں پیش کیں
الغرض سب نے ہزاروں ہی سبیلیں پیش کیں
تھا الکشن کا زمانہ اس لئے سرکار کی
مرنے والے پر نظر جانے لگی کچھ پیار کی
ہو گئی تھوڑی سی تبدیلی مروج رول میں
اُس کے دو بچے فری پڑھنے لگے اسکول میں
الغرض اک موت سے پیدا ہوئی وہ زندگی
مشغلِ شعر و ادب کی بڑھ گئی تابندگی
روحِ واہی دیکھتی تھی دور سے یہ انقلاب
اُس کی حیرت بن رہی تھی اک سوالِ بے جواب
زندگی بھر کوئی جس کا پوچھنے والا نہ تھا
جس کے فن کا جام پی کر کوئی متوالا نہ تھا
صبح سے تا شام جو اپنا قلم گھستا رہا
رات دن حالات کی چکی میں جو پستا رہا
ناقدوں نے مُڑ کے بھی جس کی طرف دیکھا نہیں
جس کے ماتھے کا پسینہ وقت نے پونچھا نہیں
آنسوؤں کی آج برکھا ہے اُسی کے نام پر
آفریں صد آفریں اس شفقتِ ایام پر
دم نکلتے ہی چڑھا سب پر عقیدت کا بخار
قدرداں حضرات کو شاید یہی تھا انتظار
کر دیا اس موت نے ثابت یہ ہم پر کم سے کم
زندگی سے موت بہتر ہے بچے اہلِ قلم
اہلِ فن کو موت سے ہرگز نہ ڈرنا چاہیے
بلکہ ممکن ہو تو کوشش کر کے مرنا چاہیے

احمد عظیم آبادی

جبر و قدر

یہ تو خیر اک حقیقت ہے کوئی وہم نہیں
سعی و پیکار سے تقدیر بدل جاتی ہے
سنگِ خارہ سے اُبلتے ہیں سمندر اپنے خود
طاقِ ظلمات میں جلتے ہیں چراغِ مقصود
عدم آباد میں پلتے ہیں صد امکانِ وجود
اور ان تلخ تجربوں کی بھی تردید محال
جبکہ ناسازیِ حالات کی زد میں آ کر
دستِ تدبیر پہ سنگین خراش آتی ہے
دوشِ امید پہ امکان کی لاش آتی ہے
نوکِ مژگاں پہ دلِ جہد کی قاش آتی ہے
یہ تو خیر اک حقیقت ہے کوئی وہم نہیں
سعی و پیکار سے تقدیر بدل جاتی ہے
کون سمجھائے مگر کیوں کبھی تقدیر کے ساتھ
سعی و پیکار کی تاثیر بدل جاتی ہے

مراسلات

عمر خیام کی رباعیاں

اس عنوان سے جناب سجاد مرزا صاحب کا ایک مراسلہ "ہماری زبان" (یکم اپریل ۱۹۷۶ء) میں شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے "رباعیات خیام" کے نئے اور قیمتی مصور ایڈیشن کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اس ایڈیشن پر عراقی عالم عبدالحق فاضل کے تبصرے کا بھی ذکر کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ قدیم ماخذوں کی اس تصریح سے خاموشی کے باوجود "یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ عمر خیام شاعری سے بے حس تھا۔" اس مراسلے میں چند امور وضاحت طلب ہیں :-

(الف) نئے ماخذوں کے نام کی تصحیح

فاضل مراسلہ نگار نے قدیم ماخذوں میں "سرقندی، زخشاری" اور "بے حقی" تین نام گنائے ہیں۔ ممکن ہے "سرقندی" (سمرقندی) کی تحریر میں کاتب صاحب سے لکھنے میں تسامح ہوا ہو (اور "س" اور "م" کے درمیان "م" رہ گیا ہو) لیکن "زمخشاری" اور "بے حقی" کے پڑھنے میں غالباً مراسلہ نگار ہی سے تسامح ہوا ہے۔ بہرحال یہ تینوں نام بالترتیب "سمرقندی" (نظامی عروضی سمرقندی مصنف چہار مقالہ)، "زمخشری" (ابوالقاسم جاراللہ محمود بن عمر الزمخشری مصنف تفسیر کشاف، الزاجر للصغار وغیرہما) اور "بیہقی" (ظہیرالدین ابوالحسن علی بن ابی القاسم زید البیہقی مصنف تتمہ صوان الحکمۃ و مشارب التجارب وغیرہما) ہیں۔ نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ کے چوتھے مقالے میں عمر خیام کی پیشین گوئی کا ذکر کیا ہے۔ بیہقی نے تتمہ صوان الحکمہ میں اس کا مستقل تذکرہ دیا ہے (تتمہ صوان الحکمہ مطبوعہ لاہور مرتبہ پروفیسر محمد شفیع ص ۱۱۲-۱۱۷)۔ زمخشری نے "الزاجر للصغار" میں خیام کا حوالہ دیا ہے۔

(ب) خیامیات کے قدیم مآخذ

۱۸۹۷ء میں روسی مستشرق ژوکوفسکی نے تمام قابل رسائی ماخذوں سے خیام کے حالات زندگی جمع کیے تھے۔ ان میں قدیم ترین ماخذ شہرزوری کی "نزہۃ الارواح" تھا جس کا زمانۂ تصنیف حسب تحقیق ڈاکٹر سخاؤ مرتب الآثار الباقیہ ۵۸۶ ہجری اور ۶۱۱ ہجری کے مابین ہے۔ بعد میں مسٹر براؤن نے "تاریخ ادبیات فارسی" کی دوسری جلد میں اور مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے چہار مقالہ کے مقدمہ میں خیامیات کا قدیم ترین ماخذ "چہار مقالہ" کو قرار دیا۔ قزوینی نے اس کا سن تصنیف ۵۵۰ھ اور ۵۵۲ ہجری کے درمیان بتایا ہے مگر میرے خیال میں اس کا سال تصنیف آخر ۵۴۷ھ ہے (اس خیال کی تائید میں ایک مبسوط مقالہ فکر و نظر علی گڑھ میں بھیجا ہے) سال گزشتہ قاری سید کلیم اللہ حسینی نے اسلامک کلچر حیدرآباد میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ چہار مقالہ سے بھی قدیم تر بیہقی کا "تتمہ صوان الحکمہ" ہے جو ان کے خیال میں ۵۴۹ھ کی تصنیف ہے حالانکہ خود کتاب کی داخلی شہادت کی رو سے یہ ۵۵۳ھ سے بعد کی تصنیف ہے اور اس طرح چہار مقالہ سے موخر ہے۔ [اگرچہ خیال یہ ہے کہ یہ ۵۶۵ھ کے بھی بعد کی تصنیف ہے]

حال ہی میں کچھ نئے مصادر دریافت ہوئے ہیں۔ آقا سعید نفیسی نے میبذی کی شرح دیوان علی کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں عمر خیام کا ذکر کیا ہے۔ اس پر ڈاکٹر معین (مرتب جدید چہار مقالہ) نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تفسیر کبیر میں عمر خیام کا ذکر نہیں ہے بلکہ عمر بن الحسام کا ذکر ہے۔ میرا خیال ہے کہ عمر خیام اور اس کے استاد عمر الا تبیری ہی کا ذکر ہے (میں نے اس خیال کی تائید میں ایک اور مبسوط مقالہ مجلہ علوم اسلامیہ چھپنے کے لئے بھیجا ہے مگر اس سے اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ تفسیر کبیر چہار مقالہ اور تتمہ صوان الحکمہ سے بہرحال موخر ہے۔

ادھر فضلائے ایران نے تین قدیم ترین ماخذ دریافت کئے ہیں جو خیام کی زندگی ہی میں مرتب ہوئے تھے :-

۱۔ آقائے مجتبیٰ مینوی نے حکیم سنائی کے ایک خط کا پتہ لگایا ہے جو انھوں نے خیام کو اپنے ایک ذاتی کام سے لکھا تھا۔

۲۔ آقائے بدیع الزماں فروزاں فر کو زمخشری کی "الزاجر للصغار" میں زمخشری اور خیام کی اس وقت کی ملاقات کا حال ملا ہے جب کہ خیام نوجوان تھا۔

۳۔ آقائے جلال ہمائی نے عبدالرحمٰن الخازنی کی "میزان الحکمہ" (مصنفہ ۵۱۵ھ) میں آبی ترازو کی تیاری کے سلسلے میں عمر خیام کا ذکر دیکھا ہے۔ ان کے علاوہ ان سے بھی زیادہ ایک اور قدیم تر ماخذ کا حوالہ سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور نے دیا ہے۔ یہ "قابوس نامہ" ہے جو خیام کی نوجوانی کے زمانہ میں تصنیف ہوا تھا۔

(ج) قدیم ماخذوں میں خیام کی شاعری کے عدم ذکر کی وجہ۔

ان قدیم ماخذوں میں سوائے "قابوس نامہ" کے خیام کی شاعری کا کوئی ذکر نہیں ہے :-

۱۔ قابوس نامہ مطبوعہ گلزار حسنی پریس بمبئی جس کے اندر سید سلیمان ندوی مرحوم نے رباعیات خیام کا قدیم ترین حوالہ بتایا ہے ہنوز دستیاب نہیں ہو سکا۔

۲۔ خازنی کی "میزان الحکمہ" "آبی ترازو" کی ساخت کے اصول و اعمال پر ہے لہٰذا اس سائنسی بحث میں شعر و سخن کے ذکر کی توقع نہیں کرنا چاہیئے۔

۳۔ حکیم سنائی کا مکتوب بنام عمر خیام انتہائی پریشانی اور ذہنی کش مکش کے زمانہ میں لکھا گیا تھا جبکہ وہ کسی الزام میں ماخوذ تھے اور بعض اوقات شرم کی وجہ سے خودکشی تک کا ارادہ کر لیتے تھے۔ ایسے عالم میں انھیں شعر و سخن کے ذکر کی فرصت کہاں ہو سکتی تھی ؎

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل ● کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

۴۔ زمخشری کی "الزاجر للصغار" میں خیام کا مستقل تذکرہ نہیں ہے۔ صرف اُس کے عہد جوانی کی ادبی قابلیت اور سعادت مندی کا ضمنی ذکر ہے۔

۵۔ نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ کے تیسرے مقالہ میں

اس کی فنی حذاقت اور صحیح پیشین گوئیوں کا ذکر کیا ہے۔ نظامی عروضی خود نجوم سے دلچسپی رکھتا تھا اور اسی حیثیت سے وہ خیام کا عقیدت مند تھا۔ مشاہیر شعرا کا ذکر اس نے دوسرے مقالے میں کیا ہے۔ لیکن یہ سب درباری شعرا ہیں جن کے قصائد نے ممدوحوں کے نام کو "زندۂ جاوید" بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے خیام جو مدیحہ نگار قصیدہ گو نہیں تھا اس تذکرے میں کہاں بار پا سکتا تھا۔ خیام کے علاوہ اور بھی غیر درباری شعرا ہیں جیسے شیخ ابوسعید ابوالخیر وغیرہ مگر چہار مقالہ میں ان کا ذرا سا اشارہ بھی نہیں ہے۔ خیام کے مشاغل شعری کے ذکر سے نظامی عروضی کی خاموشی اس وجہ سے نہیں ہے کہ خیام شاعر نہیں تھا بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اس انداز کا شاعر نہیں تھا جن کے ذکر کا نظامی عروضی نے دوسرے مقالے میں التزام کیا ہے۔

۲۔ بیہقی نے "تتمہ صوان الحکمۃ" میں خیام کا مکمل تذکرہ نہیں دیا صرف بعض ذاتی حالات کا ذکر کیا ہے۔ اور تو اور اس نے اس کی تصانیف کا بھی کوئی اشارہ نہیں کیا۔ حالانکہ ان میں سے بعض تصانیف اس کے فضل و کمال پر دال تھیں جیسے "شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس" جس کا سوا سو سال بعد محقق طوسی نے ذکر ہی نہیں کیا بلکہ "الرسالۃ الشافیہ" میں اس کے اقتباسات بھی نقل کئے تو کیا بیہقی کے عدم ذکر سے یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ اس کی تصنیف نہیں ہے؟

فضلائے عہد کے شاعرانہ کمالات کے تذکرے کے لئے بیہقی نے "وشاح الدمیہ" نام کی ایک مستقل کتاب تصنیف کی تھی۔ غالباً اس میں اس نے خیام کے اشعار بھی نقل کئے ہوں گے اور اس کے کمالات شاعری کا بھی ذکر کیا ہو گا مگر بدقسمتی سے آج یہ کتاب نایاب ہے۔ البتہ "وشاح الدمیہ" پر ابن العماد نے "خریدۃ القصر" کے نام سے جو ذیل لکھا تھا اس میں خیام کے شاعرانہ کمالات کا ذکر ہے نیز اس کے عربی اشعار بھی نقل کئے ہیں۔

ابن العماد کی خریدۃ القصر سے بعد کے تذکرہ نگاروں مثلاً شہرزوری اور ابن القفطی نے نزہۃ الارواح اور اخبار العلماء باخبار الحکماء میں اس کے اشعار نقل کئے ہیں۔

رہیں اس کی فارسی رباعیات تو عربی اشعار کے ضمن میں ان کا مذکور کیوں ہوتا۔ ہاں جب فارسی تذکرے اور فارسی تذکرے اور فارسی تصانیف لکھی گئیں تو ان کا بھی ذکر آنے لگا۔ اس قسم کا قدیم ترین حوالہ نجم الدین رازی کی "مرصاد العباد" میں ملتا ہے۔

[مزید تفصیل میرے سابقہ مراسلہ ۰ جنوری ۱۹۶۱ء میں مرقوم ہے]

(شبیر احمد غوری۔ الٰہ آباد)

غلطی ہائے مضامین .....

"ہماری زبان" مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۶۱ء کے صفحہ ۱۵ پر "متضاد تحریریں" کے عنوان سے سید رفیق مارہروی کا ایک مضمون حضرت داغ دہلوی مرحوم کے خطوط کی بابت شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں جس موضوع پر بحث کی گئی ہے اس کا فیصلہ ناظرین ہماری زبان یا دیگر اہل نظر خود کر سکتے ہیں کہ درج کوئی یا داغ غلط ہے میں موقف کتاب "داغ" یا مرتب "بزم داغ" میں کس کا پلہ بھاری ہے۔ مجھے اس موقع پر صرف انشائے داغ مرتبہ مولانا احسن مارہروی مرحوم (شائع کردہ انجمن ترقی اردو۔ دہلی) کے متعلق ایک غلط بیانی کے سلسلے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ سید رفیق مارہروی مذکورۂ بالا مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

"انشائے داغ مولانا احسن مارہروی کا ترتیب دیا ہوا ایک مجموعۂ خطوط ہے جو انھوں نے آخر زمانۂ عمر میں ترتیب دیا تھا ابھی نظرِ ثانی بھی نہ کر سکے تھے کہ وفات ہو گئی۔ میں نے اسے انجمن ترقی اردو دہلی کے حوالے کر دیا اور وہ بجنسہٖ شائع ہوا ....."

اس کے بعد کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ چونکہ انشائے داغ بغیر نظرِ ثانی کے مولانا کی وفات کے بعد شائع ہوئی اس لئے اس میں "تفاوتِ بیان" کی گنجائش ہے اور اس کی ذمہ داری (بقول جناب رفیق) مولانا احسن مارہروی مرحوم پر بھی ہو سکتی ہے۔ مذکورہ مضمون کی سطور ذیل جناب رفیق کے اس قول کی شاہد ہیں:

"انشائے داغ مولانا احسن صاحب مارہروی نے آخری زمانۂ عمر میں لکھی تھی۔ ان کی عمر اس وقت ۶۶ سال سے تجاوز کر چکی تھی ...... اس مدت میں کسی بات میں سہو ہو جانے کے بڑے امکانات ہو سکتے ہیں۔"

مجھے جناب رفیق سے صرف یہ دریافت کرنا ہے کہ انھوں نے "انشائے داغ" کا مسودہ انجمن ترقی اردو کے کس کارکن کو کب اور کہاں حوالے کیا تھا؟

خوش قسمتی سے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، سید ہاشمی فرید آبادی (جو تقسیم ملک سے پہلے انجمن کے نائب سکریٹری تھے)، محترمی پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب اور برادر محترم سید محمد احسن صاحب سابق ڈپٹی رجسٹرار مسلم یونیورسٹی ابھی حیات ہیں جن سے انشائے داغ کے مسودہ کو انجمن کے حوالے کرنے اور اس کی اشاعت کے بارے میں ضروری تصدیق اور شہادت حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہماری زبان کے ناظرین کی اطلاع کے لئے یہ عرض کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ "بزم داغ" مرتبہ جناب رفیق مارہروی، حضرت داغ دہلوی مرحوم کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جن کو مولانا احسن مرحوم نے ناقابل اشاعت قرار دیا تھا اور اس کا اقرار خود جناب رفیق نے بھی مضمون زیر بحث میں کیا ہے جبکہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"انھیں اوراق پارینہ و بوسیدہ کو میں نے از سر نو ترتیب دے کر 'بزم داغ' کے نام سے چھپوایا ہے۔"

جب مولانا احسن مرحوم کا قیمتی کتب خانہ سارقین ادب کی دستبرد سے بچ کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حوالے کیا گیا تو یہ خطوط بچی ہوئی ردی میں رہ گئے تھے اور اسی سے "بزم داغ" کے چراغ جلائے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کو شائع کرنے کے بعد فاضل مرتب نے (بزعم خود) ایک اہم ادبی خدمت انجام دی ہے اور مولانا احسن مارہروی مرحوم کو یہ تمغۂ خدمت عطا کیا ہے کہ وہ (خدا نخواستہ) آخر عمر میں مرحوم نے "انشائے داغ" پر ایسا مقدمہ لکھا جس میں سہو کی گنجائش تھی اور جس کی بنا پر "تفاوتِ بیان" کے سلسلے میں ..... داغ نویسی کا وہ طوفان برپا ہوا ہے جو مضمون زیر بحث کا موضوع ہے ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

(سید احسن مارہروی)

انجمن کا خبرنامہ

شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی میں پنڈت نہرو کی آمد

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو نے یورپ سے پچاس سے زیادہ نادر اور نایاب مخطوطات کے عکس اور مائیکروفلم حاصل کئے ہیں۔ یہ بیش قیمت مخطوطات یورپ کی لائبریریوں کی زیب و زینت ہیں اور عام طور پر ان سے استفادہ ممکن نہیں۔ چنانچہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو نے انھیں "سلسلۂ اشاعت مخطوطات اُردو" کے نام سے حواشی اور تعلیقات کے ساتھ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ان میں سے ہر سال ایک کتاب شائع کی جائے گی۔ اب تک دو کتابیں شائع کی جا چکی ہیں۔ ایک فضلی کی دہ مجلس یا کربل کتھا ہے جو ۱۷۳۲ء میں لکھی گئی اور شمالی ہندوستان کی سب سے پہلی تصنیف نثر ہے۔ اس کا دنیا میں صرف ایک نسخہ ہے جو ٹیوبن گن یونیورسٹی (جرمنی) کے ذخیرۂ اشپرنگر سے حاصل ہوا ہے۔ دوسری کتاب عمدۂ منتخبہ یا تذکرۂ سرور ہے جس میں ۹۹۶ اردو شاعروں کا ذکر ہے۔ اس کے دنیا میں صرف دو نسخے ہیں۔ ایک لندن میں اور دوسرا پیرس میں۔ یہ دونوں کتابیں ہندوستان کے محبوب وزیراعظم شری جواہرلال نہرو کی اجازت خاص سے ان کے نام معنون کی گئی ہیں اور یکم اپریل ۱۹۶۱ء کو دہلی یونیورسٹی کے کانوکیشن ہال میں ایک خاص تقریب منعقد کی گئی جس میں یہ کتابیں انھیں پیش کی گئیں۔

اس اہم موقع پر پنڈت جی نے اپنی تقریر میں اُردو کی اہمیت اور افادیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ اُردو کی مخالفت کرتے ہیں وہ تنگ نظر ہیں اور ان کا یہ نظریہ خود ان کی اپنی زبانوں کی ترقی کے لئے رکاوٹ بن رہا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ زبان عوام کی مدد سے ترقی کرتی ہے۔ کوئی حکومت کسی خاص زبان کو عوام کی مدد کے بغیر زندہ نہیں رکھ سکتی اور نہ دباؤ ڈالنے سے اس کی ترقی کو روک سکتی ہے۔ اُردو کوئی غیر ملکی زبان نہیں بلکہ ہمارا عزیز سرمایہ ہے اور ہمیں چاہئے کہ اس سے غفلت نہ کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندی اور اُردو دونوں نے ہندوستان کے مشترک کلچر کے ارتقا میں مدد دی ہے۔ ان دونوں زبانوں کا ایک دوسرے سے دور ہونا مناسب نہیں۔ پنڈت جی نے اس سلسلے میں یورپ کی مثال پیش کی اور کہا کہ وہاں لوگ ایک دوسرے کی زبان سے محبت کرتے ہیں اور دوسری زبانوں کو بڑی محبت سے سیکھتے ہیں۔ اس سے نہ صرف تعلقات مضبوط ہوتے ہیں بلکہ ادب بھی ترقی کرتا ہے۔ آئس لینڈ چھوٹا سا ملک ہے لیکن اس کا ادب نہایت وسیع اور مالا مال ہے اور آئس لینڈ کا ایک ادیب نوبل پرائز بھی حاصل کر چکا ہے۔ ہندی اور اُردو میں فرق تو ہے لیکن ان دونوں کی بنیاد ایک ہے اور اس وقت اسی بنیادی رشتے پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ ہندی کے لئے تو ملک میں سب کچھ کیا جا رہا ہے لیکن اُردو کی خدمت بھی ضروری ہے۔ اس سے ہندی کو بھی فائدہ ہوگا کیونکہ جو سرمایہ اُردو کے پاس ہے وہ ہندی کے پاس نہیں اور جو ہندی کے پاس ہے اس کی اُردو کو ضرورت ہے۔ چاہئے کہ دونوں زبانوں کے ادیب مل کر کام کریں۔

تقسیم ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے پنڈت جی نے کہا کہ شروع میں ہماری مخالفت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس سے مشترک کلچر کو نقصان پہنچے گا۔ بہرحال اب بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ہندوستان اور پاکستان تہذیبی زندگی میں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ نہ ہو جائیں ورنہ ہماری زندگی میں توازن پیدا نہیں ہو سکے گا۔

آخر میں موصوف نے شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی کی کارگزاری پر اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اس قدر قلیل مدت میں یہاں جو کام ہوا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ دہلی سے اُردو کے تعلق کی بنا پر دہلی یونی ورسٹی میں اُردو کو اس کا صحیح مقام دیا گیا ہے ورنہ یہ ایسا ہی ہوتا کہ کوئی ماں اپنے بچے کو نہ پہچان سکے۔ پنڈت جی نے اس بات پر زور دیا کہ دہلی کی طرح پنجاب اور اترپردیش کی یونی ورسٹیوں میں بھی اُردو کے کام پر توجہ کی جائے گی۔

کتابوں کی پیش کش کے فرائض ڈاکٹر این۔ کے سدھانتہ وائس چانسلر دہلی یونی ورسٹی نے انجام دئے۔ ان دو نادر کتابوں کے علاوہ شعبۂ اُردو کے اساتذہ اور رفقا کی مطبوعات بھی وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کی گئیں۔

اس سے پہلے محترم وزیر اعظم کا خیر مقدم کرتے ہوئے صدر شعبۂ اُردو پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے کہا کہ دہلی یونیورسٹی میں اردو کا علیٰحدہ شعبہ صدر جمہوریہ ہند کے اعلان مورخہ ۹ نومبر ۱۹۵۹ء کی رو سے قائم ہو گیا ہے۔ ہم نے کام کا ایک منصوبہ بنایا ہے اور سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دی ہے کہ ادب قدیم کے حیات افروز عناصر سے واقفیت بہم پہنچائی جائے اور اُردو کی اہم قلمی کتابوں کو حواشی اور تعلیقات کے ساتھ شائع کیا جائے۔ اب تک دو کتابیں شائع کی جا چکی ہیں۔ ایک فضلی کی دہ مجلس ہے اور دوسری تذکرہ سرور ہے۔ ہم اردو کا مطالعہ جدید ہند آریائی زبانوں کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ اُردو کی جڑیں ہماری گنگا جمنی تہذیب میں دور تک چلی گئی ہیں اور اس وقت ہندوستان کی کوئی دوسری زبان سرکاری زبان یعنی ہندی سے اتنی قریب نہیں جتنی اردو ہے۔ شعبۂ اُردو دبستان دہلی کی چند اہم شخصیتوں پر مونوگراف بھی تیار کر رہا ہے اور اس سلسلے کی پہلی کتاب پروفیسر رامچندر پر ہے۔ مستقبل کے کام میں سب سے زیادہ اہمیت ببلوگرافیکل سروے اور ذو لسانی لغت کو دی جائے گی۔

(سکریٹری شعبۂ اُردو
دہلی یونی ورسٹی)

علاقائی زبانوں کی ترقی

لوک سبھا میں مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر کے۔ایل۔ شری مالی نے شری اجیت سنگھ سرحدی کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ایوان کے سامنے علاقائی زبانوں کی ترقی سے متعلق یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی اسکیم کی تفصیلات بیان کیں۔

اس اسکیم کی رو سے علاقائی زبانوں میں مطالعہ کے لئے دو انعامات دیے جائیں گے ان میں سے ایک انعام ۵۰۰ روپے کا اور دوسرا ۲۵۰ روپے کا ہوگا۔ یہ انعامات ہر بھارتی یونیورسٹی میں ایک مقابلے کے امتحان کے نتائج پر پیش کئے جائیں گے۔

وزیر موصوف نے مزید بتایا کہ انعام حاصل کرنے والے ہر امیدوار کو نقد انعام کے علاوہ ایک ماہ تک اس زبان کے علاقے میں سیاحت کرنے کی اجازت ہوگی جس زبان میں اس نے انعام حاصل کیا ہو۔

امتحان ہر سال میٹریکیولیشن کے معیار کا ہوگا اور ذیل کے گروپوں اور درج ذیل زبانوں میں لیا جائے گا۔

سنسکرت گروپ۔ (گروپ ۱) آسامی، بنگالی، گجراتی، مرہٹی اور اڑیہ۔

(گروپ ۲) کشمیری، پنجابی، اردو اور ہندی۔

دراوڑین گروپ۔ تامل، تلگو، ملیالم اور کنڑ۔

وزیر موصوف نے مزید بتایا کہ یونیورسٹی اور اس سے وابستہ کالجوں میں درج رجسٹر تمام طلبہ اس امتحان میں شرکت کے مستحق ہونگے بشرطیکہ ان کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ ہو۔

شاخ بلاسپور

انجمن ترقی اردو بلاسپور (ایم۔ پی) نے ۱۵ مئی، جون تک بلاسپور ضلع میں ۱۶ پرائمری اردو اسکول کھولنے کی مہم جاری کر رکھی ہے۔

کٹگھورا اور رتن پور، دو مقامات میں اسکول کھل چکے ہیں۔

تیسرے اسکول کے سلسلے میں مورخہ ۹ اپریل کو نائب صدر مقصود احمد تقی و ناظم عبد السبحان نے اکلترا کا دورہ کیا۔

ایک عام جلسہ میں مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل انجمن ترقی اردو اکلترا کی تشکیل اور اردو اسکول کا اجرا عمل میں آیا۔

صدر: یاد محمد، نائب صدر: اشفاق حسین، ناظم: عبد الرؤف، نائب ناظم: محمد ابراہیم، خازن: محمد ہارون،

ممبران: محمد یوسف، ظفر احمد، سردار خان، عبد السمیع، نور محمد، محمد ابراہیم اور جبرائیل۔ (سلیم بخش وکیل نائب ناظم شاخ بلاسپور)

بقیہ: شوق نیموی

ہے سے شوق نیموی سے ہے تلمذ اے زبیر
پایہ کیسا بڑھ گیا تقریر کا تقدیر سے
اُستاد شوق کا جو تصور بندھا زبیر
مضمونِ شوق دل سے اُسی وقت اُبل پڑے
زنگ آلودہ ہے گو جوہر مری شمشیر کا
پر نبیرہ خاص ہوں سلطان عالمگیر کا

پھر سید نجیب اشرف صاحب ندوی رسالہ ندیم گیا بہار نمبر ۱۹۳۲ء میں لکھتے ہیں۔ مجھے اس وقت تک شاہزادہ زبیر کی صرف تین تصانیف کا پتہ چلا ہے ان میں ایک تاریخ جس کا نام امواج سلاطین ہے ان میں مغلیہ سلاطین کے حالات ہیں اور یہ قلمی تصاویر سے مزین ہے۔ (۲) دیوان زبیر۔ (۳) گوہر شہوار۔ یہ پانچ تاریخی مثنویوں کا مجموعہ ہے، بندہ فوقانی بن شوق نیموی کہتا ہے کہ جناب فصیح الدین بلخی صاحب نے دسمبر ۱۹۵۰ء کے پرچہ اشارہ پٹنہ میں لکھا ہے کہ ان کی ایک کتاب موج سلطانی ہے، شاید یہ ایک دوسری کتاب علاوہ امواج سلاطین ہے واللہ اعلم۔ کاتب الحروف محمد عبدالرشید فوقانی بن شوق نیموی کہتا ہے کہ منجملہ تلامیذ حضرت شوق نیموی مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی بھی ہے۔ چنانچہ ہم سے خود مولانا نے بیان فرمایا تھا کہ میں نے ایک غزل لکھ کر مولانا شوق کو دکھائی تھی۔ اور راقم مذکور کہتا ہے کہ مولانا شوق کی صدارت میں مولانا غلام محی الدین ابوالکلام آزاد اور مولانا غلام یٰسین آہ وغیرہ کی تقریر دلپذیر بھی ہوئی ہے جیسا کہ رسالہ سیر ہنگال مطبوعہ ۱۳۲۰ھ مولفہ شوق نیموی میں مرقوم ہے اور رسالہ آزاد کی کہانی مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء کے چند مقامات میں مولانا آزاد کا شاعری میں شاگرد ہونا مذکور ہے جسے راقم الحروف نے ۶ مارچ ۱۹۵۹ء کو مقامی اخبار میں بطور روایت بالمعنیٰ بحر ہزج مسدس محذوف العروض و الضرب و سالم الصدر والابتدا و الحشو میں نظم کر کے شائع کیا دیا ہے۔

چھپی آزاد کی ہے جب کہانی • جو ہے آزاد کی اپنی زبانی
ملیح آباد کے نامی گرامی • کہ ہے رزاق جن کا نام نامی
انھیں آزاد نے اپنی کہانی • لکھا دی جیل میں جب تھے مقامی
ہوئی مطبوع دہلی میں کہانی • یہی ہے تذکرہ کی جلد ثانی
بیان ہے بوالکلام دہلوی کا • کہ ہوں تلمیذ شوقِ نیموی کا
بیان ان کا ہے ذکر نیموی میں • کہ ہوں شاگرد اردو شاعری میں
ہوا اشعار میں اصلاح لینا • پسند دل ہوا شاگرد ہونا
توجہ خوب شوقِ نیموی کی • مرے اشعار کی اصلاح میں تھی
دعاگو ہے یہ فوقانی خدایا • لحد ہو ان کی نورانی خدایا
کشادہ قبر ہو ان کی الٰہی
کہ ہو آرام تا یوم التنادی

اور حلقۂ تلمذ میں جناب سید حسن مرتضیٰ شفق، عماد پوری گیاوی بھی ہیں جیسا کہ یادگار وطن ۱۳۱۲ ہجری مولفہ شوق نیموی صفحہ ۱۱۸ میں مسطور ہے۔ اور رسالہ ریاض شفق مطبوعہ ۱۹۱۳ء صفحہ ۳ میں لکھا ہے کہ حضرت شفق کا پہلے تخلص حسن تھا پھر مولانا شوق نیموی مرحوم نے شفق تجویز کر دیا دو تین برس تک جو کچھ کہتے رہے جناب کوثر خیرآبادی اور مولانا شوق نیموی دونوں ہی کو دکھایا گئے پھر ۱۸۹۵ء سے مستقل طور پر حضرت امیر مینائی رح کی شاگردی و اصلاح سے مستفید ہوتے رہے اور مولانا ظہیر احسن شوق نیموی سے فن طب کے علاوہ تحصیل حدیث بھی کی اور دیوان شوق مطبوعہ ۱۳۲۲ھ کے صفحہ ۱۲۶ میں حضرت شفق لکھتے ہیں۔

شفیق و محسن و مخدوم مولانا ظہیر احسن
کہ منت کش رہا برسوں میں جس کے لطف و احساں کا
ادب میں طب میں کچھ دن استفادہ سے مشرف تھا
طفلِ بے زباں ابجد شناس اُس کے دبستاں کا

اور رسالہ موسومہ تحجیہ تاریخ مطبوعہ ۱۳۲۹ ہجری میں شوق نیموی کی تاریخ وفات یوں لکھی ہے:۔

آہ مولانا ظہیر احسن محدث باکمال
ماہر فن سخن مغفور شوق نیموی
لکھ شفق سال وفات ان کا مع القابِ تمام
کامل و علامہ و مشہور شوق نیموی

۱۳۲۲ھ

اور زمرۂ تلامیذ میں جناب حکیم خدا بخش ولد جناب عبداللہ مغفور طالب بنگالی شہر ملتان محلہ گیریان بھی نظر آتے ہیں۔ آپ اپنے کلیات طالب مطبوعہ ۱۳۱۱ھ میں فرماتے ہیں:۔

عکس دلبر سے ہے گھر گھر دھوپ سونے کا ورق
کہتے تھے سب ہو گی کیونکر دھوپ سونے کا ورق

حضرت شوق سخنور کا یہ اے طالب ہے فیض
ورنہ مشکل ہے سراسر دھوپ سونے کا ورق

اور منجملہ شاگردان جناب مرزا علی رضا متخلص بہ ضیا ساکن عظیم آباد محلہ شاہ کی املی بھی معروف و مشہور ہیں۔ ان کے مطبوعہ دیوان کا تاریخی نام ریاض شاداب معروف بہ دیوان ضیا ہے۔ رسالہ نقوش لاہور کے شخصیات نمبر ۱۹۵۶ء میں بحوالہ تحریر جناب شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی لکھا ہے کہ ضیا کا دیوان عرصہ ہوا شائع ہوا تھا اب ناپید ہے۔ یہ شوق نیموی کے شاگردوں میں تھے اھ اور رسالہ ماہنامہ اشارہ پٹنہ بابت دسمبر ۱۹۵۸ء میں جناب فصیح الدین بلخی صاحب رقمطراز ہیں۔ عظیم آباد میں شوق کے تلامذہ میں مرزا علی رضا ضیا عظیم آبادی نے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ راقم (یعنی بلخی صاحبؒ) ان کا مفصل حال رسالہ تہذیب ۱۹۵۳ء میں شائع کیا ہے اھ اور افراد تلامیذ میں جناب ابوالخیر خیر دربھنگوی بھی نظر آرہے ہیں، ان کا کچھ حال الکلام پٹنہ مجریہ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۰ء شمارہ نمبر ۵ صفحہ ۴ سطر ۱ میں بیان جناب سید بدرالدین احمد عظیم آبادی نے بضمن تذکرہ اشعار مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی شائع کردہ اخبار الپنچ پٹنہ مورخہ ۵ جولائی ۱۹۰۸ء تحریر فرمایا ہے، فوقانی نیموی کہتا ہے کہ یادگار وطن مطبوعہ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) کے صفحہ ۱۱/۱۲ میں زیر اسامی شاگردان شوق یہ مرقوم ہے۔ ان کا (یعنی ابوالخیر خیر کا) تاریخی نام مظہر عالم ہے۔ اکثر نامی اخباروں کے نامہ نگار رہے ہیں۔ آجکل الپنچ میں اکثر ان کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ پنچ میں اپنا نام ابوالظرفا لکھا کرتے ہیں انتہی ملخصا۔ اور رسالہ معاصر پٹنہ ماہ اگست ۱۹۴۲ء میں جناب قاضی محقق عبدالودود صاحب جنھوں نے دیوان جوشش پر محققانہ بسیط مقدمہ لکھا ہے۔ اور انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے ۱۹۴۱ء کو شائع کیا ہے، اس کے صفحہ ۴۴ میں لکھتے ہیں۔ حضرت شوق نیموی صوبہ بہار کے مشہور عالم دینیات و زباں داں اور شاعر خوش گو تھے۔ مذہبی موضوعات پر ان کی بعض کتابیں درس میں ہیں۔ ان کا دیوان مدت ہوئی طبع ہوا تھا لیکن اب کمیاب ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

کسی کو دیکھ کر تابِ کب لئے دل نکلتا تھا
بلا سے چوٹ کھائی تھی سر محفل سنبھلتا تھا
دل شوق حسینوں سے لگانا نہیں اچھا
ہو جاؤگے بدنام زمانا نہیں اچھا
دامن کبھی جھٹکتے ہیں کبھی ملتے ہیں وہ ہاتھ
اے شوق ابھی ہوش میں آنا نہیں اچھا

حضرت مولانا شوق نیموی نے فیض باطنی اور ارادت تصوفی اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس سرہٗ سے حاصل فرمائی۔ اور آپ خلیفہ مجاز بھی تھے چنانچہ عمدۃ العناقید میں لکھتے ہیں:-

ثم اجازنی بجمیع مرویاته و بالاخذ العهد علی طریق شیخه فی الطریقة الشاہ محمد آفاق المجددی۔

مناجات فوقانی

خدایا رحم تو بر نیموی باد	کہ ما را در سن آثار السنن داد
کرم ساختی او را خدایا	معظم ہم بکن فرزند او را
تو دانی نام من عبدالرشید است	ز بار جرم پشت من خمیدہ است
بہ شعرم ہست فوقانی تخلص	مگر دارم بہ تحتانی تخصص
ز پستی دہ خلاصی یا الٰہی	ز رحمت کن عطا ما را بلندی
ز فیض فضل دہ توفیق ما را	ز علم دین بدہ تحقیق ما را
خبر دادی مرا در سورۂ طور	کہ پیوندد بہ آبائے خودش پور
اگرچہ پور باشد در عمل کم	کنی تا ہم پسر را با پدر ضم
شمارم چوں ز احسان فراواں	کہ بیروں شد ز تعداد ہزاراں

شمار احسان ز فوقانی محال است
ز طفلی تا بہ پیری باکمال است

سلہ قولہ پشت من الخ دریں التفات ست از غائب بمتکلم ۱۲

سلہ در سورہ طور وارد شدہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ و در تفسیر معالم التنزیل کاشف عن ابن عباس رض اخبر اللّٰہ عز و جل انه یجمع لعبدہ المومن ذریته فی الجنة کما کان یحب فی الدنیا ان یجتمعوا الیه یدخلهم بدرجته بعمل ابیه من غیر ان ینقص الاباء من اعمالهم شیئا و فی طریق اخری عنه و ان کانوا دونه فی العمل لتقر بهم عینه ۱۲

سلہ قولہ پیری الخ چرا کہ عمرم دریں ایام بہ شصت و نہ کردہ چہ والدم علام در یادگار وطن بہ صفحہ ۱۲۳ می نگارند

شد چو پیدا پور من عبدالرشید　　مایۂ آرام جاں نور البصر
شوق کلکم زود رقم تاریخ سال　　جلوۂ یکشنبہ و شہر صفر
۱۳۱۲ھ

چند علمی کتابیں

۱۔ قومی تہذیب کا مسئلہ	ڈاکٹر عابد حسین	۶/۰۰ روپے
۲۔ ہندستانی سماجیات	ڈاکٹر جعفر حسین	۴/۵۰ "
۳۔ اطلاقی سماجیات	"	۴/۵۰ "
۴۔ انواع فلسفہ	ظفر حسین خاں	۵/۵۰ "
۵۔ نغمیات افراد	ولی الرحمٰن	۱/۷۵ "
۶۔ کچھ زر کی بابت	ابو سالم	۴/۵۰ "
۷۔ سیاسیات کے اصول حصہ اول	ہارون خاں شروانی	۳/۰۰ "
۸۔ " " دوم	"	۲/۰۰ "
۹۔ " " سوم	"	۱/۰۰ "
۱۰۔ اسلامی فن تعمیر	ضیاء الدین احمد وحست	۶/۰۰ "

انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ

تبصرہ

—— انور معظم

فروغِ اُردو لکھنؤ (جگر نمبر)

مدیر اعزازی: ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی۔
مرتبین: سید احتشام حسین۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی۔
صفحات: ۶۱۶۔ قیمت: چھ روپے۔
ملنے کا پتہ: دفتر فروغِ اُردو۔ نخاس روڈ۔ لکھنؤ۔

اُردو کی ایک بد قسمتی یہ بھی ہے کہ اس میں مختلف تنقیدی مسائل پر چند مضامین تو مل جاتے ہیں مگر ان ادیبوں اور شاعروں پر جنھیں اُردو ادب کی آبرو سمجھا جاتا ہے، کتابوں کا کیا ذکر مبسوط مضامین کو نگاہیں ڈھونڈتی ہی رہ جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہم مختلف ادبی نظریوں پر تعارفی تحریروں کی منزل ہی سے گزر نہیں پائے ہیں۔ عملی تنقید ہمارے لئے کچھ اجنبی اجنبی سی ہے۔ جنھیں ادبی اصطلاح میں اہلِ نظر کہا جاتا ہے وہ بھی ابھی تک کسی فن کار پر قلم اٹھانے سے پہلے قبولِ عام کی سند طلب کرتے ہیں۔ اور اگر وہ بے چارہ یہ معرکہ سر کر لے تب بھی زندگی بھر اور زندگی کے بعد ایک عرصے تک اس کی تخلیقی کاوشیں ایک سچے جوہری کی نگاہ نکتہ شناس کو ترستی رہتی ہیں۔

ادھر چند برسوں سے رسائل کے مدیروں نے ادبا و شعرا پر کتابوں کی کمی پورا کرنے کا ذمہ اپنے سر لے لیا ہے اور چند ادبی شخصیتوں پر خاصے صحت مند نمبر زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر سرِ بازار لائے جا چکے ہیں۔ فروغِ اُردو لکھنؤ کا جگر نمبر اسی گرمیِ بازار کو بر قرار رکھنے کی تازہ ترین کوشش ہے۔

جگر ان چند ادبی شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنھیں اپنی زندگی ہی میں عزت کے ساتھ ساتھ پڑھنے والوں کی محبت بھی مل گئی اور اب اس محبت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

اس نمبر میں جگر کی شخصیت اور شاعری پر پچاس سے زائد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین، جگر کے بارے میں آج کے چند جلیل القدر ادبا کی رائیں، چند شاعروں کے مجموعوں پر جگر کے پیش لفظ، "شعلۂ طور" اور "آتشِ گل" کا مختصر انتخاب، اور جگر کی چند تصاویر شامل ہیں۔ لکھنے والوں میں رشید احمد صدیقی، آلِ احمد سرور، احتشام حسین، وزیر آغا، عبادت بریلوی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، علی جواد زیدی، منظر سلیم، آفتاب احمد صدیقی حسن، ایم۔ این کول، سوامی ناتھم، عطا محمد شعلہ، شجاعت علی سندیلوی، ظہیر احمد صدیقی، احسان احمد، راز مراد آبادی، قیسی الفاروقی، ناظر کاکوروی وغیرہ نظر آتے ہیں۔ مضامین میں جگر کی رندانہ پاکیزگی اور شاعرانہ زندگی کو ساتھ ساتھ رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیشتر مضامین میں جگر کے تصورِ حسن و عشق کی عام فہم انداز میں تشریح ملتی ہے۔ اس کے علاوہ جگر کی مذہبیت، وطن دوستی، نظریۂ حیات و فن اور عصری میلانات کو ان کے کلام کے ذریعہ واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُردو غزل میں جگر کا مقام متعین کرنے میں ایک عرصہ تک جگر کی محبوب شخصیت حائل رہے گی۔ اس نمبر کے تقریباً تمام لکھنے والے اس محبوبیت کے جادو سے اپنے کو بچانے میں ناکام رہے، اور ایسی باتیں کم کہی گئی ہیں جن سے جگر کے قاری کی معلومات میں کوئی خاص اضافہ ہو۔ شخصیت پر لکھے گئے مضامین شاید اسی لئے نسبتاً زیادہ دلچسپ نظر آتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جگر نے خود اس بات کی تردید کی تھی کہ وہ اصغر گونڈوی کے شاگرد ہیں۔ وہ شاعری میں استادی شاگردی کے قائل نہ تھے۔ "بلبل کو چہکنا کس نے سکھایا ہے!" شاعری ان کے نزدیک الفاظ کی صناعی نہیں بلکہ ایک عبادت تھی جس کے لئے دردمند دل اور خلوص دونوں ناگزیر ہیں۔ انھوں نے شاعری کے نام پر حکومت کے آگے ہاتھ پھیلایا نہ فلمی اداروں کی پیش کش قبول کی۔ وہ شاعری کو محض الہامی بھی نہیں مانتے تھے بلکہ اس کی تکمیل کے لئے مسلسل غور و فکر اور مصرعوں کی اصلاح اور تراش خراش کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔

جب تک اہلِ نظر ادب کی ممتاز ہستیوں کو کتابی پیمانے پر موضوع بنانے کی طرف توجہ نہیں کرتے رسائل کے نمبروں ہی کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا